علامہ عبدالعزیز میمن

خورشید رضوی

علامہ عبدالعزیز میمن کا نام پہلی مرتبہ میں نے اپنے استادِ گرامی ڈاکٹر صوفی محمد ضیاء الحق صاحب سے سُنا۔ میں اس وقت غالباً ایف۔اے کا طالب علم تھا۔ ڈاکٹر صوفی صاحب علوم عربیت کے بحرِ زخّار ہیں۔ ان کی زبان سے کسی کی ایسی توصیف بہت بڑے معنی رکھتی تھی۔ اسی زمانے میں میمن صاحب کو، ڈاکٹر صوفی صاحب ہی کی وساطت سے پہلی مرتبہ دیکھنے کا شرف بھی نصیب ہوا۔ وہ یوں کہ صوفی صاحب نے ایک تحقیقی کام کے سلسلے میں کراچی کا سفر اختیار فرمایا اور ازرہِ محبت مجھے بھی اپنے چند ہم سفروں میں شامل کیا۔ کراچی میں ان کی منزلِ مقصود جو مقام تھا اس کا نام شاید "معارفِ اسلامیہ" تھا یا اسی سے مشابہ کوئی نام۔*

یاد آتا ہے کہ ایک روز میں بھی ڈاکٹر صوفی صاحب کے ہمراہ وہاں گیا اور وہیں پہلی مرتبہ میمن صاحب کی زیارت ہوئی۔ تاہم اس زیارت کو ملاقات کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ بس دونوں بزرگ بیٹھے کچھ مشورہ کر رہے تھے اور میں ذرا فاصلے سے انہیں دیکھ سکتا تھا۔ پھر بھی یہ دھندلا سا تصور میرے حافظے کے تصویر خانے میں موجود ضرور ہے۔ کتب خانے کی الماریوں کے سامنے میمن صاحب اِدھر اُدھر آ جا رہے ہیں.... کوئی کتاب لئے ڈاکٹر صوفی صاحب سے کچھ گفتگو فرما رہے ہیں.... پاؤں میں غالباً فلیٹ بوٹ ہیں جو بعد کو بھی میں نے انہیں پہنے دیکھا۔

اب میرے ساتھ آٹھ نو سالوں پر سے جست لگاتے ہوئے آگے چلیے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب ایم۔اے

---

* یہ مرکزی ادارۂ اسلامیات کے نام سے ادارہ تحقیقات اسلامی کا ابتدائی ہیولا تھا جو مولانا میمن کے ہاتھوں تشکیل پا رہا تھا (مدیر)

کرنے کے بعد لیکچرار کی حیثیت سے ملازمت اختیار کئے مجھے ڈھائی برس ہو چکے تھے۔ اکتوبر ۱۹۶۴ء میں علالت کے سبب مجھے گورنمنٹ کالج سرگودھا سے مسلسل پانچ ماہ کی رخصت پر لاہور میں زیرِ علاج رہنا پڑا۔ کچھ عرصہ مکمل طور پر صاحب فراش رہنے کے بعد نومبر کے لگ بھگ میرے معالج نے مجھے صبح و شام ہلکی پھلکی سیر و تفریح کا مشورہ دیا۔ اورینٹل کالج میری مادرِ علمی تھی۔ میرے لئے اس کے در و بام میں بڑی کشش تھی چنانچہ میں نے گاہ بگاہ وہاں جانا شروع کر دیا۔ ایک روز مینارٹ ہال۔ (اب شیرانی ہال) کے سامنے والے برآمدے میں استادِ محترم جناب عبدالصمد صارم سے ملاقات ہو گئی۔ انہوں نے اپنے مخصوص دلچسپ انداز میں پوچھا "میمن صاحب سے مل لئے ہو؟" میں نے عرض کیا "نہیں" فرمایا مل لو، یادگارِ زمانہ ہیں یہ لوگ۔

میمن صاحب ان دنوں پروفیسر حمید احمد خاں صاحب مرحوم وائس چانسلر جامعہ پنجاب کی مساعی کے نتیجے میں شعبۂ عربی اورینٹل کالج کے صدر تھے۔ صارم صاحب مجھے ان کے کمرے میں لے گئے اور میرے ننھیالی جد مولانا احمد حسن محدث امروہوی کے حوالے سے میرا تعارف کرایا۔ میمن صاحب نے مصافحہ فرمایا اور بتایا کہ وہ ایک زمانے میں امروہہ گئے تھے اور مولانا امروہوی سے ملے تھے۔ یوں پہلی مرتبہ میں نے عربی زبان و ادب کے اس شہرۂ آفاق عالم کو قریب سے دیکھا۔ رنگت گندمی، سینہ چوڑا، سفید ریش، قد درازی میں انگشت نما چہرہ جو پرانی تصویروں میں پُرگوشت ہے، اب استخوانیت کی طرف مائل تھا۔ اونچی دیوار کی ٹوپی پہنے وہ مجھے مرزا غالب سے مشابہ نظر آئے۔

انہی دنوں ایک روز شام کو اپنے گھر کے قریب پونچھ روڈ پر ٹہل رہا تھا کہ دیکھتا کیا ہوں مرزا غالب لمبا کوٹ اور فلیٹ بوٹ پہنے چھڑی ہاتھ میں لئے خراماں خراماں چلے آ رہے ہیں پہلے میں ٹھٹکا کہ غلط فہمی نہ ہو۔ مگر علیک سلیک کے بعد تصدیق ہو گئی۔ لاعلمی میں انہوں نے چھڑی میرے پاؤں پر رکھ دی اور خاصے وزن سے اس پہ ٹیک بھی لگا دی اور گفتگو فرمانے لگے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ اس وقت مجھے حارث بن حلزہ کا خیال آیا جس کے بارے میں روایت ہے کہ دربارِ حیرہ میں معلقہ پیش کرتے ہوئے وہ کمان کی ٹیک لئے تھا اور

کمان کی نوک اس کی ہتھیلی کو چیرتی چلی جا رہی تھی مگر اُسے کچھ خبر نہ تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ یہاں زد میں میرا پاؤں تھا اور انہیں کچھ خبر نہ تھی۔ خیر اس سے قبل کہ تکلیف کا احساس پاسِ ادب پر حاوی ہو سکتا انہوں نے پہلو بدلا اور میں رہا ہو گیا۔

خوش قسمتی یہ ہوئی کہ جامعہ پنجاب کی طرف سے میمن صاحب کو سمن آباد میں جو کوٹھی رہائش کے لئے لے کر دی گئی تھی وہ میرے مکان سے کوئی ڈیڑھ ہی فرلانگ پر ہو گی۔ میمن صاحب کی طبیعت میں سادگی، بے تکلفی اور فاصلہ نہ رکھنے کا جو انداز تھا اس نے جرأت دلائی اور ان سے قریب قریب روز ہی ملاقات رہنے لگی۔ صورت یہ تھی کہ شام کا کھانا کھا کر میں ان کے ہاں جا پہنچتا۔ وہ بھی سیر کے لئے تیار ہوتے مجھے ہمراہ لے کر سڑک پر نکل آتے۔ آدھ پون گھنٹہ چہل قدمی رہتی جس کے دوران وہ اپنے مخصوص انسائیکلو پیڈیائی انداز میں مختلف و متنوع موضوعات پر نہایت دلچسپ گفتگو فرماتے رہتے۔ کبھی استنبول اور مراکش کے کتب خانوں کی سیر دکھاتے کبھی ڈاکٹر طٰہٰ حسین سے اپنی واحد مختصر ملاقات کا حال سناتے۔ کبھی ہندوستان کے بعض عربی کتبوں کا ذکر کرتے جنہیں بڑی عرق ریزی کے بعد انہوں نے پڑھ ڈالا تھا۔ کبھی ایک عرب شاعر احمد صافی دُردی النجفی (غالباً یہی نام تھا) کا تذکرہ فرماتے جس نے رباعیاتِ خیام کا عربی میں بہت عمدہ منظوم ترجمہ کیا اور کبھی علیگڑھ کی یادیں تازہ کرتے۔ ان کا اندازِ گفتگو ان کی مجموعی شخصیت کی طرح برجستہ، بے تکلف اور تصنع سے پاک ہوتا تھا۔ جب کسی بات پر زور دینا ہوتا تو چلتے چلتے رُک جاتے اور تھوڑی دیر کھڑے ہو کر گفتگو کرتے۔ کبھی عربی میں گفتگو شروع ہو جاتی کبھی اردو میں۔ آواز کا اتار چڑھاؤ کسی رکھ رکھاؤ کے بغیر موضوع کے نشیب و فراز کے ساتھ ساتھ چلتا تھا۔ دو تین ماہ پر پھیلی ہوئی ان صحبتوں کے نقوش آج تقریباً بیس برس کے بعد بھی میرے ذہن سے محو نہیں ہوئے اگرچہ اب ایک غبار سا ان کے اور میرے درمیان حائل ہونے لگا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ابھی وقت ہے کہ اس امانت کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کر دیا جائے جس کا حافظہ اور عمر انسان سے کہیں بڑھ کر ہے میری اور ان کی ان

صحبتوں میں کوئی دوسرا شخص بالعموم حائل نہیں رہا۔ میرے تمام تر تاثرات ذاتی و شخصی نوعیت کے ہیں۔ یہ وہ میمن صاحب ہیں جو خاص میرے مشاہدے میں آئے۔

میمن صاحب کی گفتگو آزاد تلازم خیال کے تحت ہوتی تھی لہذا نہ تو اسے کسی ترتیب میں لانا آسان ہے اور نہ تمام باتوں کا احاطہ کرنا۔ بس گھر سے نکلتے ہوئے کسی بھی موضوع کا ایک دھاگہ ان کے ہاتھ آجاتا تھا اور وہ راستے بھر اُسے ادھیڑتے رہتے تھے اور واپسی پر دو چار رنگ برنگ گولے میری جیب میں ہوتے تھے۔ مثلاً ایک روز میں نے کسی کتاب کے بارے میں کہہ دیا کہ پڑھنے والی کتاب ہے" اس پر ان کی طرف سے فوراً کچھ یوں جواب آیا۔ ارے، ارے، یہ کیا کہا آپ نے! ارے بھئی آپ تو امروہے کے ہیں۔ کیا امروہے میں یہ اُردو بولی جاتی تھی؟ بھئی پڑھنے والے" تو آپ ہیں۔ کتاب پڑھنے "والی" کیسے ہو سکتی ہے؟ بھئی پڑھنے کی کتاب کہیئے۔ پڑھنے کے لائق کتاب کہیئے ... وغیرہ وغیرہ"۔

میمن صاحب خود راجکوٹ کے تھے۔ اُردو اُن کی زبان نہ تھی لیکن ڈپٹی نذیر احمد کے براہ راست شاگرد تھے اور اہل زبان میں ایک عمر بسر کی تھی۔ ہر چند کہ لہجہ دلی والوں کا نہ تھا مگر اُردو سلیقے کی بولتے تھے۔ تاہم "نوکرانی" کو وہ ہمیشہ "نوکریانی" کہا کرتے تھے اور "پت جھڑ" کو "پت جھاڑ" یہ لفظ میں نے اس طرح سنا کہ ان دنوں ان کے ایک صاحبزادے۔ غالباً محمد عمر میمن امریکہ گئے ہوئے تھے۔ ان کا خط آیا جس میں انہوں نے وہاں کے موسم کا نقشہ بڑے ادیبانہ انداز میں کھینچا تھا کہ پت جھڑ کا موسم ہے۔ ہوا چل رہی ہے اور درختوں کے پتے مسلسل گرتے ہوئے بڑے بڑے دل کش معلوم ہو رہے ہیں ... وغیرہ وغیرہ۔ میمن صاحب نے یہ حصہ مجھے سنا کر تبصرہ فرمایا کہ دیکھئے یہ صاحبزادے مجھے "پت جھاڑ" کی کہانیاں سنا رہے ہیں حالانکہ میں خود پت جھاڑ سے بھی آگے گزر چکا ہوں۔

ڈپٹی نذیر احمد صاحب کے تلمذ پر میمن صاحب کو فخر تھا۔ "ڈپٹی صاحب" کہہ کر انہیں یاد کرتے۔ ان کی عربیت کے بے حد معترف تھے۔ فرماتے تھے عربی میں صحیح معنوں میں میرے استاد وہی تھے (شاگردوں

میں ڈاکٹر سید محمد یوسف مرحوم کا ذکر خاص محبت سے کرتے تھے) ایک روز میں نے پوچھا کہ فرحت اللہ بیگ نے ڈپٹی صاحب کی جو کہانی لکھی ہے کیا یہ ان کی صحیح تصویر ہے ؟ فرمایا "بالکل"۔ فرحت اللہ بیگ نے ڈپٹی صاحب کے ہاں جو جُزرسی دکھائی ہے اس کا اثر میمن صاحب کی طبیعت میں بھی تھا خیر بیگ صاحب کو تو یہ حسرت رہ گئی کہ کبھی شریک طعام نہ ہو سکے مگر مجھے یاد آتا ہے کہ ایک روز سیر کو نکلتے ہوئے میمن صاحب نے ریاحی تکالیف کے لئے ادرک کا مربہ کھایا تو یہ کہہ کر کہ لیجئے آج آپ کو ادرک کا مربہ کھلاتے ہیں، مجھے بھی شریک فرمایا یہ درست ہے کہ ستر برس کے پیٹے میں بھی وہ گھر سے یونیورسٹی بس میں آیا جایا کرتے تھے۔ (میں بھی ایک مرتبہ ان کے ہمراہ دو منزلہ بس میں سوار ہوا) شام کو بیکری سے انڈہ مکھن خریدنے بھی خود جاتے اور انڈوں کی چھوٹائی بڑائی پر بحث بھی کر سکتے تھے اور یہی ایسے پہلوان کے ہاں دیکھنے میں آئے کہ نظریہ ظاہر انہیں بخل سے منسوب کیا جا سکتا تھا اور کیا جاتا تھا مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ مسئلہ دراصل اپنی اپنی ترجیحات کا ہے چنانچہ یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ اواخر عمر میں انہوں نے غالباً ایک لاکھ روپے کا عطیہ جامعہ پنجاب کو دیا کہ اسے فکس کرا دیا جائے اور اس سے حاصل ہونے والے منافع سے مسلسل عربی کی کتب لائبریری کے لئے خریدی جاتی رہیں، خیر ذکر ڈپٹی صاحب کا تھا۔ ان کے بارے میں بتاتے تھے کہ خود حقہ پیا کرتے تھے مگر کسی اور کو اس حقے کی نے منہ میں لینے کی اجازت نہ تھی۔ آنے جانے والوں کے لئے میز پر چرٹ دھرے رہتے تھے کہ جسے طلب ہو ان سے شوق پورا کرے۔

ایک روز عربی زبان و ادب پر ڈپٹی صاحب کی غیر معمولی گرفت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ ان کے عزیزوں میں کا ایک لڑکا جو کالج میں پڑھتا تھا، ان کے پاس آیا اور کہا کہ کالج میں امیر کابل تشریف لا رہے ہیں اور اس موقع پر اسے عربی کے کچھ شعر پڑھ کر سنانے کے لئے دس منٹ دیئے گئے ہیں۔ ابو العتاہیہ کا دیوان ان دنوں داخل نصاب تھا۔ لڑکے نے وہ اشعار منتخب کئے جن کا مطلع ہے :

لَا یَذْھَبَنَّ بِکَ الْأَمَلُ   حَتّیٰ تُقَصِّرَ فِی الْعَمَلِ

لیکن عرض کیا کہ یہ اشعار تو چار پانچ منٹ میں تمام ہو جائیں گے۔ مدّعا یہ تھا کہ اسی زمین میں ڈپٹی صاحب خود کچھ کہہ دیں تاکہ وہ پورے دس منٹ اسٹیج پر رہنے کی خواہش پوری کر سکے۔ ڈپٹی صاحب کے کہے ہوئے نو شعر میمن صاحب کو یاد تھے۔ سیر کے دوران مجھے سنائے۔ آج میمن صاحب سے سنی ہوئی تقریباً سبھی باتیں محض حافظے سے نقل کر رہا ہوں لیکن ڈپٹی صاحب کے اشعار کو نایاب تصور کرتے ہوئے میں نے اُسی دن نوٹ بھی کر لیا تھا۔ شعر یوں ہیں :۔

اَللّٰہُ قَدَّرَ فِی الْاَزَلْ — اَنْ لَّا نَجَاۃَ بِلَا عَمَلْ
اَلنُّصْحُ لَیْسَ بِنَافِعٍ — وَالسَّیْفُ قَدْ سَبَقَ الْعَذَلْ
وَالْمَرْءُ لَیْسَ بِخَالِدٍ — وَالْعَیْشُ اَمْرٌ مُحْتَمَلْ
کُنْ حَیْثُ شِئْتَ مِنَ السُّهُوْلِ وَفِی الْبُرُوْجِ وَفِی الْقُلَلْ
یُدْرِکْکَ مَوْتٌ فِی الزَّمَانِ وَلَا یَزِیْدُکَ فِی الْاَجَلْ
لَذَّاتُ دُنْیَا کُلُّهَا — سَمٌّ مَّشُوْبٌ بِالْعَسَلْ
اَلْعُمْرُ فَانٍ فَالنَّجَا — وَالْمَوْتُ آتٍ فَالْعَجَلْ
حتّام تقلیدُ الهوىٰ — والِامَ تجدیدُ العِلَلْ
اَلْمُبْتَلٰی بِعَلَائِقِ الدُّنْیَا حِمَارٌ فِی الْوَحَلْ

شعر سُنا کر میمن صاحب نے تبصرہ فرمایا کہ دیکھا! ڈپٹی صاحب کا کلام ابوالعتاھیہ کے اشعار سے ایسا یکجان ہے کہ تمیز کرنا مشکل ہے۔

کبھی اپنے زمانہ طالب علمی کے واقعات سنانے لگتے تھے۔ ایک روز بتایا کہ کچھ عرصہ میرا قیام مسجد نیلا گنبد لاہور کے ایک حجرے میں بھی رہا ہے۔ اسی دور کے کہے ہوئے اپنے ایک مدحیہ قصیدے کا ذکر بھی کیا۔ ایک شعر مجھے یوں یاد آتا ہے :

كَأَنَّ الفَاضِلَ القَاضِي تَنَبَّا ۔۔۔۔ بِهِ إِذْ قَالَ دَامَ عُلَا العِمَادِ

اب یاد نہیں آتا کہ ممدوح کون تھا۔ غالباً اس دور کی کوئی مقتدر شخصیت تھی۔ بہرحال اتنا تو شعر سے ظاہر ہے کہ نام "عماد" تھا۔ اس تلمیح کا پس منظر بھی میمن صاحب نے خود ہی بیان فرمایا کہ کاتب اصفہانی عماد الدین نے ایک روز القاضی الفاضل عبدالرحیم کو گھوڑے پر سوار دیکھا تو یہ عجیب و غریب جملہ بولا: "سِرْ فَلَا كَبَا بِكَ الْفَرَسُ" جاؤ سدھارو، خدا کرے تمہارا گھوڑا لغزش نہ کھائے"۔ ندرت یہ تھی کہ اس پورے جملے کو اگر الٹ دیں تب بھی یہی جملہ باقی رہتا ہے۔ قاضی فاضل نے خداداد فراست سے فوراً اس نکتے کو بھانپا اور برجستہ جواب دیا: "دَامَ عُلَا العِمَادِ" خدا کرے عماد کی بلندی ہمیشہ قائم رہے۔ اس میں ایک طرف عماد اصفہانی کے لقب کی رعایت ہے پھر عماد ستون کو کہتے ہیں چنانچہ اس کی بلندی کی دعا میں ایک معنوی رعایت ہے علاوہ ازیں اس جملے کو بھی اگر اُلٹ دیں تو جوں کا توں رہتا ہے[۳]۔

میمن صاحب غالب کے مدّاح تھے۔ ایک مرتبہ غالب کے فارسی دیوان سے اپنی خصوصی دلچسپی کا ذکر فرمایا۔ تاہم ان کے اپنے ذوقِ شعر پر مجھے شاعرانہ لطافت سے زیادہ عالمانہ مہارت کا غلبہ محسوس ہوا۔ ان کا انتخاب شعر اکثر و بیشتر لفظی محاسن کے گرد گھومتا نظر آتا تھا۔ عربی کے لاتعداد اشعار مع پس منظر ان کے حافظے میں ہمہ وقت موجود تھے۔ جب کسی مناسبت سے کوئی شعر یاد آجاتا تو چلتے چلتے رک کر اکثر اس کی تمہید میں کوئی پرجوش جملہ بولتے مثلاً "لیجئے آج آپ کو دنیا کا بہترین شعر سنائیں" یا ایسا شعر آپ کو کہیں نہ ملے گا / کوئی نہ سنائے گا وغیرہ۔ یہ ان کا مخصوص انداز تھا جس کا مقصد صرف اتنا ہی ہوتا تھا کہ شعر کے کسی خاص نکتے کی طرف توجہ منعطف کرائی جائے۔ یاد پڑتا ہے کہ ایک مرتبہ انھوں نے شاید دنیا کا بہترین شعر کہہ کر جو شعر سنایا اس میں چہرۂ محبوب اور چہرۂ مہتاب کی مماثلت کو ذرا سا بل دے کر پیش کیا گیا تھا:

بِتَّ اُرِیْھَا ...... بِدالضحیٰ؟[4] حتّٰی اِذَا غَابَ اَرَتْنِیْہ

ایک مرتبہ ایک بڑی ہی برجستہ و بے ساختہ تضمین سنائی جس کا مزا آج تک لیتا ہوں۔ فرمایا کہ اندلس کے شہر لوشہ میں ایک قاضی صاحب تھے جن کی بیوی بڑی ذہین و فطین تھی۔ ایک مرتبہ وراثت کا پیچیدہ مسئلہ عدالت میں پیش ہوا۔ قاضی صاحب گھر آئے تو سوچ بچار میں غرق تھے۔ بیوی نے پوچھا تو انہوں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ یہ تمہارے سمجھنے سمجھانے کا معاملہ نہیں ہے تاہم بیوی نے اصرار کر کے پوچھ ہی لیا اور پھر ایک معقول حل بھی پیش کر دیا۔ قاضی صاحب حیران ہوئے اور آئندہ کے لئے کرسئ عدالت کی پشت پر ایک دریچہ رکھوایا جس میں ان کی بیگم بیٹھ جاتیں اور اکثر مسائل میں قاضی صاحب ان کے مشورے سے مستفید ہوتے رہتے۔ ایک روز ایک شاعر کا مقدمہ ان کی عدالت میں پیش ہوا۔ اس نے جو یہ صورتِ حال دیکھی تو یہ شعر کہہ ڈالے۔

بِلَوْشَةَ قَاضٍ لَہٗ زَوْجَةٌ وَ اَحْکَامُھَا فِی الْوَرَیٰ جَارِیَہْ
فَیَالَیْتَہٗ لَمْ یَکُنْ قَاضِیاً وَیَالَیْتَھَا کَانَتِ الْقَاضِیَۃ

آخری مصرع میں آیت قرآنی[5] کو جس بے ساختگی سے اقتباس کیا گیا ہے محض خدا کی دین ہے

ایک روز اندلس کے شہر مالقہ کے ایک شاعر[6] کے یہ شعر سنائے :

مَالَقَۃُ حُیِّیْتَ یَا تِیْنَھَا اَلْفُلْکُ مِنْ اَجْلِکَ یَاتِیْنَھَا
نَھٰی طَبِیْبِی عَنْکَ فِی عِلَّتِی یَا لِطَبِیْبِی عَنْ حَیَاتِی نَھٰی

ہر قافیے میں "یا تینھا" کے الفاظ نئی وضع اور نئے مفہوم میں آئے ہیں جو ایک یادگار اتفاق ہے

ایک روز یہ ذکر فرمایا کہ عربی میں "قال" صرف کہنے کے معنوں میں نہیں آتا بلکہ اشارہ کرنے کا مفہوم بھی ادا کرتا ہے اور اس ضمن میں یہ نادر اور دلچسپ شعر سنائے

مَرَرتُ بِعَطّارٍ وَیَدُقُّ قَرنفُلاً
وَمِسْکاً وَکافُوراً فَقُلتُ لَہٗ......

فَقالَ لِیَ العَطّارُ رُدَّ قَرنفُلِی
وَمِسْکِی وَکافُورِی فَقُلتُ لَہٗ.....

دونوں شعروں کے مصرع ثانی میں جہاں میں نے نقطے لگا دیئے ہیں وزن شعر کے اعتبار سے وہاں کم از کم ایک سبب خفیف ورنہ ایک وتد مجموع بروزن "فَعِلُن" کی کمی ہے۔ مفہوم کے اعتبار سے بھی دونوں جگہ بات ادھوری ہے یعنی میں ایک عطار کے پاس سے گزرا جو لونگ، مشک، اور کافور کوٹ رہا تھا سو میں نے اس سے کہا... اس پر عطار نے مجھ سے کہا کہ میری لونگ مشک اور کافور واپس کردو سو میں نے اس سے کہا....

دونوں جگہ معلوم نہیں کہ کیا کہا۔ میمن صاحب نے وضاحت فرمائی کہ دونوں جگہ "قلتُ" سے مراد اشارہ کرنا ہے نہ کہ کہنا"۔ انہوں نے اس اشارے کی عملی توضیح یوں فرمائی کہ پہلا شعر پڑھ کر آخر میں ناک کے راستے سانس زور سے اندر کو کھینچا اور سانس کے سُر سے وزنِ شعر کو پورا کر دیا یعنی میں نے عطار کو لونگ مشک اور کافور کی خوشبو سونگھنے کا یوں اشارہ کیا۔ دوسرے شعر میں میمن صاحب نے اسی وزن پر سانس کو باہر نکالتے ہوئے وزنِ شعر کو ہموار کر دیا یعنی جب عطار نے واویلا مچایا کہ میری خوشبوئیں واپس کرو تو میں نے کہا "یہ لو"۔

میمن صاحب کے بے ساختہ پن اور مخصوص طرز بیان میں بعض اوقات معمولی سی باتیں بھی بہت مزا دیتی تھیں۔ میں اب تک سوچتا ہوں تو خیال ہی خیال میں لطف اٹھاتا رہتا ہوں۔ مگر مشکل یہ ہے کہ تحریر میں وہ فضا اور وہ انداز منتقل نہیں ہو سکتا۔ ایک روز شام کو ان کے ہاں پہنچا تو سیر کے لئے نکلنے سے پہلے انہوں نے باہتمام ریڈیو کھولا اور بہت کان دھر کر سننے بیٹھ گئے۔ کچھ دیر ہم دونوں پر سکوت طاری رہا پھر

میری طرف دیکھ کر برجستہ فرمایا ذرا ہی دیر میں آپ چرچل کے مرنے کی خبر سنیں گے۔ مجھے خبریں سننے اور اخبار پڑھنے سے کبھی دلچسپی نہیں رہی لہٰذا مجھے یکسر بے خبر پاکر انہوں نے مزید کہا "آپ کو معلوم نہیں کئی روز سے بے ہوش پڑا ہے"۔ پھر انہوں نے خوب کان لگا کر اس خبر کا انتظار کیا مگر جہاں تک مجھے یاد ہے چرچل اُس روز نہ مر سکا۔

میمن صاحب بسا اوقات شعر کو ایک مخصوص ترنم میں سنایا کرتے تھے۔ یاد پڑتا ہے کہ ایک روز ابن الرومی کا ذکر چھڑا اور انہوں نے بتایا کہ مرض الموت میں جب اُسے یہ معلوم ہوا کہ طبیبوں کی رائے میں پیشاب رُک جانے اور اس کے نتیجہ میں موت واقع ہو جانے کا اندیشہ قوی ہے تو اس نے خود کہا۔ (یہ شعر غالباً سرہانے بیٹھے بیٹھے رُک کر میمن صاحب نے اپنے مخصوص لحن میں پڑھا جس کا اتار چڑھاؤ اب تک کانوں میں گونج رہا ہے)۔

غَدًا يَنْقَطِعُ الْبَوْلُ وَيَأْتِي الْمَوْتُ وَالْهَوْلُ

گفتگو کا رُخ صرف و نحو اور زبان و بیان کی طرف مڑ جاتا تو بڑے پتے کی باتیں روا روی میں سنا ڈالتے۔ فرمایا کرتے تھے کہ افعال ثلاثی مجرد کو ضبط کرنے کے لئے میں نے مکمل مختار الصحاح کو باقاعدہ خاطر نشیں کرنے کی کوشش کی ہے۔ دوپہر کے کھانے کے بعد مجھے بے سدھ ہو کر پڑ رہنے کی عادت ہے۔ قیلولے کی اس نیم خوابی کے وقفے میں حقے کے علاوہ "مختار الصحاح" پاس رکھ لیتا تھا۔ مدتوں اس کی ورق گردانی کرتے کرتے آخر افعال ثلاثی مجرد کے لغات کو بڑی حد تک تسخیر کر لیا۔

ایک روز سیر کے دوران "الجار قبل الدار" میں "الجار" کو زور دے کر بفتح السراء پڑھا اور پھر دہرایا کہ "الجار" نہ کہ "الجار"۔ بضم السراء۔ سمجھانا یہ مطلوب تھا کہ "الجار" سے قبل کوئی فعل امر مقدر مانا جائے گا جس کا یہ مفعول ہوگا لہٰذا حالتِ نصبی میں ہوگا۔

اُنہی دنوں "الروض الأنف" مع متن سیرت ابن ہشام میرے زیر مطالعہ تھی۔ ایک جگہ ذکر آیا

کہ جس زمانے میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابو ایوب انصاریؓ کے ہاں قیام فرما تھے ایک روز کھانے میں پیاز یا لہسن کی آمیزش ہو گئی۔ آپؐ نے یہ کھانا ہاتھ ڈالے بغیر واپس کر دیا۔ حضرت ابو ایوبؓ کے دریافت کرنے پر آپؐ نے انہیں تو کھا لینے کی اجازت دی لیکن خود اپنے بارے میں فرمایا "أُناجی اناجی"۔ یہ لفظ "اناجی" میری سمجھ میں نہ آیا۔ اسی شام میمن صاحب کے پاس پہنچا تو ان سے ذکر کیا۔ کتاب اس وقت میرے پاس نہ تھی۔ زبانی ہی لفظ کے ہجے اور سیاق و سباق بیان کیا۔ تھوڑے سے توقف کے بعد فرمایا بھئی یہ ہے "اُناجی" بصیغہ مجہول یعنی مجھ سے سرگوشی کی جاتی ہے"۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ مطلب فی الفور آئینہ ہو گیا یعنی مجھ سے تو فرشتے ہم کلام ہوتے ہیں اور یہ بو اُن کو ناگوار گزرتی ہے۔ ایسے مواقع پر میمن صاحب خود اپنی ستائش میں بھی دو چار لفظ کہہ دینے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے تھے اور حق تو یہ ہے کہ یہ اُن کا حق تھا۔ بقولِ غالبؔ :

لائقِ مدح در زمانہ چو نیست

خویشتن را ہمی سپاس کنم

اس روز اسی کیفیت میں اپنے مخصوص اسلوب بیان میں کچھ یوں ارشاد ہوا۔ "آج آپ کو روئے زمین پر ایسا آدمی نہ ملے گا جو یوں عبارت دیکھے بغیر آپ کا یہ مسئلہ سلجھا دے"

"الروض الاُنف" کے نام سے یاد آگیا کہ وہ اس کتاب کے بڑے مدّاح تھے ایک روز اپنے خاص ستائشی اسلوب میں فرمایا بھئی سیرت کے باب میں یہ آسمانی کتاب ہے اور نحو کے باب میں سیبویہ کی کتاب آسمانی ہے۔

زبان کے عوامی روزمرہ کے سلسلے میں ایک روز علمائے عربیت میں سے کسی کا لطیفہ سنایا ۔ (نام مجھے یاد نہیں رہا) کہ صرف و نحو پر عالمانہ درس دینے کے بعد جب گھر لوٹے بے تکلفی کی فضا میں بیٹھے تو ملازم کو آواز دے کر کچھ اس قسم کی بات کہی کہ فلاں سبزی مع جڑوں کے لاؤ۔ انہوں نے اس مطلب کے

کے لیے جو لفظ استعمال کئے وہ عامی لہجے میں تھے یَعْرُوْقُوْ۔ اس پر ایک شاگرد نے جو انہی کے علم و فضل سے اکتساب کر کے بیٹھا تھا عرض کیا۔ یا سیّدی ھَلاَّ قُلْتَ یَعْرُوْقِہٖ ، استاد محترم آپ اس کے بجائے "یَعْرُوْقِہٖ" فرماتے تو مناسب تر ہوتا اس پر بھڑک اُٹھے اور چلا کر کہا:

یا غُلامُ المتنبی یَعْرُوْقُوْ لا یَعْرُوْقِہٖ لڑکے وہی عروقو لاؤ نہ کہ عُرُوْقِہٖ۔

ایک روز کچھ گفتگو معلقہ امرؤ القیس کے آخری اشعار خصوصاً اس شعر کے حوالے سے ہوئی:

كَأَنَّ مَكَاكِيَّ الْجِوَاءِ غُدَيَّةً صُبِحْنَ سُلَافًا مِنْ رَحِيقٍ مُفَلْفَلِ

مگر اب یہ یاد نہیں آتا کہ موضوعِ گفتگو کیا تھا۔ شاید اعراب کی کچھ بحث تھی۔ یا شاید میں نے شعر کسی مناسبت سے پڑھا تھا۔ ایک جملہ جو غالباً اسی گفتگو سے متعلق تھا آج ایک خوشگوار یاد بن کر ذہن میں گونج رہا ہے۔ میمن صاحب نے فرمایا تھا آپ کے اعراب غنیمت ہیں۔ ایک روز اور اس کی دلچسپ یاد بھی یاد آ رہی ہے۔ سرِ راہ چلتے چلتے رک کر فرمانے لگے بھئی آپ میں عربی ادب پڑھنے کی صلاحیت تو تھی لیکن۔ (سر سے پاؤں تک میری جانب ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے) اس صحت کے ساتھ آپ کیا خاک عربی ادب پڑھیں گے۔ ان کا اشارہ ان دنوں میری مخدوش صحت اور عربی ادب کی صبر آزما وسعت کی طرف تھا۔ غالباً اسی موقع پر اپنی نسبت یہ ارشاد فرمایا کہ میری صحت تو جوانی میں بڑی مضبوط تھی چنانچہ بڑی جانکاہ محنت کر سکا۔

عربی زبان و ادب سے میرے گہرے شغف کی بنا پر وہ مجھ پر خصوصی شفقت فرمانے لگے تھے گاہے گاہے خود ٹہلتے ہوئے غریب خانے پر چلے آتے۔ امالی ابن درید کی ایک مائیکرو فلم ان کے پاس تھی۔ میں نے دلچسپی کا اظہار کیا تو بے جھجک میرے حوالے کر دی۔ حیرت کی بات ہے کہ انہوں نے اس سلسلے میں کسی احتیاط کا مظاہرہ نہ کیا۔ میں نے جوتوں کے ڈبے میں محدب عدسہ لگا کر پروجیکٹر بنانے کا جو طریقہ بچپن میں سیکھا تھا اس کو آزمایا اور ایک چھوٹا سا ریڈر بنا کر اس مائیکرو فلم کو پڑھنے کی کوشش کی میمن صاحب خود بھی

تشریف لائے اور میری اس بچگانہ سی کوشش میں پوری دلچسپی لیتے ہوئے فرمایا بھئی معلوم ہو گیا کہ آپ اگر کوشش کریں تو ایک چھوٹا سا ریڈر کھڑا کر سکتے ہیں۔ اس نام نہاد ریڈر یا پروجیکٹر کی تاریں کھلی یعنی شو کے بغیر تھیں۔ ہمارے گھر کا ملازم اکرم جو بڑا طرار لڑکا تھا دونوں تاریں ہاتھ میں تھامے کھڑا تھا جب کہا جاتا تو وہ دونوں تاریں بجلی کے سوراخوں میں داخل کر کے پروجیکٹر کو روشن کر دیتا۔ میمن صاحب اس کی چابکدستی اور بے خوفی سے بہت متاثر ہوئے اور کچھ یوں تبصرہ فرمایا بھئی یہ آپ کا ملازم تو تأبّطَ شرًّا ہے تأبّطَ شرًّا۔ موت کو چکمہ دے کر نکلتا ہے" پھر تأبّطَ شرًّا کے ان اشعار کا حوالہ دے کر وضاحت فرماتے رہے۔

فَخَالَطَ سَهْلَ الْأَرْضِ لَمْ يَكْدَحِ الصَّفَا
بِهِ كَدْحَةً وَالْمَوْتُ خَزْيَانُ يَنْظُرُ
فَأُبْتُ إِلَى فَهْمٍ وَلَمْ أَكُ آئِبًا
وَكَمْ مِثْلِهَا فَارَقْتُهَا وَهِيَ تَصْفِرُ

اس روز پروجیکٹر سے جو عبارت دیوار پر روشن ہوئی اس میں ایک راوی کے نام کو میں نے "الثوری" پڑھا۔ میمن صاحب وسعتِ مطالعہ اور استحضار میں بلا کے آدمی تھے فوراً اصلاح فرمائی کہ یہ "الثوری" نہیں "التوّذی" ہوگا۔ انہوں نے مطالعے پر کسی جاں کاہ محنت کی تھی اس کا اندازہ اس بات سے ہوگا کہ ایک روز از روئے شفقت انہوں نے میرے حافظے کی تعریف فرمائی تو میں نے عرض کیا کہ حافظہ تو دراصل آپ کا ہے کہ اس پیرانہ سالی میں آپ کو اس قدر ادبی سرمایہ نوکِ زبان ہے۔ فرمایا نہیں آپ ایک بار سن کر یاد رکھتے ہیں جبکہ میں نے یہ سب کچھ سو سو مرتبہ نظر سے گزارا ہے مجھے اُن کی شفقت کا ایک اور واقعہ بھی یاد رہے گا۔ ایک روز شام کو معمول کے مطابق پہنچا تو کوٹھی کے ایک چھوٹے سے بغلی کمرے میں لیٹے حقہ پی رہے تھے۔ کہنے لگے بھئی اچھا ہوا آپ آ گئے۔ آپ سے

ایک ضروری بات کرنا تھی۔ ہمارے ہاں شعبۂ عربی میں ایک لیکچرار کی اسامی خالی ہے۔ اس کے لئے کئی امیدوار ہیں۔ حمید احمد خاں صاحب وائس چانسلر مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ کیا کوئی مناسب آدمی مل گیا ہے میں نے کہا ایک آدمی نظر میں تو ہے مگر مشکل یہ ہے کہ وہ امیدوار نہیں ہے۔ انہوں نے کہا آپ اس کی پروانہ کریں اگر وہ خواہشمند ہو تو کوئی نہ کوئی صورت نکالی جا سکتی ہے۔ تو بھئی میرا اشارہ آپ کی طرف تھا۔ اب آپ بتائیں کہ کیا آپ یونیورسٹی میں آنا پسند کریں گے۔ میں نے عرض کیا کہ سب سے پہلے تو آپ کے اس حسن ظن پر سراپا سپاس ہوں جو میرے لئے بہت بڑی سند کی حیثیت رکھتا ہے۔ تاہم دو ایک باتیں میرے لئے باعث تردد ہیں۔ ایک تو میں سرکاری ملازمت میں ہوں وہ چھوڑنی پڑے گی۔ فرمایا اس کی فکر نہ کریں جو کچھ فوائد اس کے اب تک ہوئے ہیں وہ آپ کی تنخواہ میں شامل ہو جائیں گے۔ میں نے عرض کیا دوسری بات ذرا نازک ہے۔ ہمارے ہاں یونیورسٹیوں کی فضا میں بالعموم سیاست کاری اور جوڑ توڑ کا غلبہ نظر آتا ہے۔ اور میری طبیعت کو اس سے مناسبت نہیں۔ یہ سنتے ہی لیٹے لیٹے اٹھ بیٹھے اور دو ٹوک انداز میں فرمایا یہ آپ نے بالکل ٹھیک کہا۔ یہ آپ کے بس کا روگ نہیں۔ مجھ ستر برس کے بوڑھے کا گزارہ یہاں دشوار ہے۔ بھلا آپ کس کھیت کی مولی ہیں نا بھئی آپ وہیں ٹھیک ہیں"۔

ہمارا ملازم اکرم جس کا اوپر ذکر ہوا آزاد کشمیر کا تھا۔ نہایت ذہین اور بلا کا پھرتیلا۔ میمن صاحب اس کے بڑے مداح تھے۔ حالانکہ ہم اس کی ضرورت سے زیادہ پھرتی پر بسا اوقات تنگ آجاتے تھے۔ دوا کا وقت ہو جاتا تو وہ فوراً جہاں کہیں میں بیٹھا ہوتا پہنچ جاتا اور دوا کی گولی خود اپنے ہاتھ سے سیدھی میرے منہ میں رکھ کر پانی کا گلاس پیش کرتا۔ ایک روز میمن صاحب غریب خانے پر تشریف فرما تھے کہ ان کی موجودگی میں اس نے یہی حرکت کی۔ میں تو شاید کچھ خفیف ہی ہوا ہوں گا مگر وہ اس کے حق میں رطب اللسان تھے ارے بھئی کیسا ملازم ہے آپ کے پاس۔ کس قدر راحت

ہے آپ کو۔ ایک وہ ہمارا ملازم ہے بدھو ہے ترا بدھو۔ (ان کے ہاں بھی آزاد کشمیری کا ایک لڑکا ملازم تھا) دیر تک وہ اپنے ستائشی کلمات دہراتے رہے۔

کبھی امورِ صحت پر گفتگو چھڑ جاتی تو بہت سی تجربے کی باتیں سناتے۔ سیر کے فوائد کے بڑے قائل تھے۔ ایک زمانے میں انہیں کچھ عوارض کے باعث سیر کی از حد پابندی کرنا پڑی تھی۔ فرماتے تھے کہ میں فوجیوں کی طرح مارچ کرتا تھا حتیٰ کہ کمر ٹوٹنے لگتی تھی مگر کمر پہ پٹکا کس کے چلتا ہی چلا جاتا تھا۔ اب اگرچہ بوڑھا ہوں مگر آپ دیکھتے ہیں کہ شام کے کھانے کے بعد اپنے آپ کو اب بھی گھسیٹتا ہوں۔ ڈالڈا گھی کے سخت خلاف تھے۔ وہ اسے "ڈال" کے بجائے "حال" سے "دالدا" بولتے تھے اور اسے مہلک سمجھتے تھے۔ ان کا یہ جملہ اب بھی میرے کانوں میں گونج رہا ہے "دالدا موت ہے موت"۔ ایک موقع پہ یاد نہیں، مصر یا کسی اور ملک میں ایک چشمے کے صحت بخش پانی کا ذکر بڑی تعریف سے کیا۔ اپنے مخصوص انداز میں بے ساختہ فرمایا۔ بھئی اس چشمے کا پانی کیا پیا تھا میں تو تھوڑے ہی عرصے میں پھول کر ایسا ہو گیا جیسے بھینسا ہوتا ہے بھینسا۔

علیگڑھ کا ذکر چھڑ گیا تو معروف مستشرق پروفیسر کرنکو کے علمی استغراق کے واقعات سناتے اور تعریف کرتے رہے۔ فرماتے تھے کہ اس شخص کو اپنا اور اپنے گرد و پیش کا کچھ ہوش نہ تھا۔ لیکن اگر یہ پوچھا جائے کہ فلاں سفر میں جو یہ نے کس درخت کے نیچے پیشاب کیا تھا تو یہ اُسے یاد ہو گا۔ کہنے لگے کہ ایک روز ڈنر تھا۔ موسم سخت سردی کا تھا۔ میں نے دیکھا کہ پروفیسر کرنکو دروازے سے داخل ہوئے اور حاضرین پر نظر دوڑائی۔ مجھے دیکھا تو سیدھے وہیں چلے آئے اور فی الفور عربی ادب پر گفتگو شروع کر دی۔ کھانا ختم ہو گیا۔ لوگ اُٹھ گئے مگر پروفیسر صاحب کو اپنی باتوں میں کچھ خبر نہ ہوئی۔ بالآخر میری تحریک پہ اُٹھے اور باہر آئے۔ یہاں سخت سردی کے باوجود کھلے آسمان تلے کھڑے ہو کر پھر گفتگو شروع کر دی۔ اتنے میں ملازم اندر سے ایک اوور کوٹ لے کر آیا کہ یہ کسی کا پڑا رہ گیا ہے۔ پروفیسر کرنکو نے اس طرف مطلق توجہ نہ دی مگر میں سمجھ گیا کہ ہو نہ ہو یہ کوٹ انہی کا ہے۔ چنانچہ اُن سے کہا کہ غور فرمائیے کہیں یہ کوٹ آپ کا تو نہیں؟ اس پہ ایک نگاہِ غلط انداز اس پہ ڈالی مگر پہچان نہ سکے۔ پھر کچھ سوچ کر فرمایا

ہاں یہ میرا ہو سکتا ہے کیونکہ آج سردی خاصی ہے اور میری بیوی میرا بہت خیال رکھتی ہے۔ ممکن نہیں کہ اس موسم میں اس نے مجھے اوور کوٹ کے بغیر آنے دیا ہو۔ اسی اثنا میں ملازم ایک نفیس ہیٹ بھی اٹھا لایا۔ اسے بھی پروفیسر کرنکو نے اسی استدلال پر قبول کیا۔

میمن صاحب بتاتے تھے کہ کرنکو کی بیوی واقعی اُن کا بے حد خیال رکھتی تھی۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں میم اور صاحب دونوں غالباً شملے کی سیر کو چلے گئے۔ چھٹیاں ختم ہونے کو آئیں تو پروفیسر صاحب فوراً علیگڑھ واپس آنے اور درس و تدریس کا آغاز کرنے کے لئے بیتاب ہو گئے جبکہ بیگم گرمی کی شدت کے پیش نظر چند اور قیام کرنا چاہتی تھیں پروفیسر صاحب نے کہا کہ ٹھیک ہے میں چلتا ہوں تم کچھ دن بعد چلی آنا۔ بیگم نے کہا مجھے فکر ہے تم سفر میں اپنا سامان بھی سنبھال سکو گے یا نہیں۔ اس پر پروفیسر صاحب نے اسے اطمینان دلایا۔ مگر وہ انہیں خوب جانتی تھی۔ خود گاڑی میں سوار کرانے آئی۔ سیٹ ریزرو کرا دی۔ کپڑے غسل خانے میں لٹکا دیئے اور بار بار کہا کہ دیکھو اسی سلیپنگ سوٹ میں اُتر کر نہ چلے جانا۔ جب علیگڑھ نزدیک آئے تو کپڑے بدل لینا۔ سامان بار بار دکھایا کہ یہ رکھا ہے بھول نہ جانا۔ پروفیسر صاحب ہر بار اسی کی تاکید کا جواب یہ کہہ کر دیتے رہے کہ ڈیئر تم قطعاً فکر نہ کرو میں سب سنبھال لوں گا۔ الغرض وہ غریب رخصت ہوئی اور پروفیسر صاحب غالباً طلبہ سے اپنی ملاقات اور اپنے لیکچر کے موضوعات میں مستغرق جب علی گڑھ پہنچے تو اسی شب خوابی کے لباس میں ملبوس، بیگ بینی و دو گوش سیدھے گھر تک چلتے چلے گئے۔ نوکر حاجی صاحب کی واپسی کے انتظار میں کوٹھی کے لان وغیرہ درست کر رہے تھے۔ انہوں نے جب دیکھا کہ بیگم ہمراہ نہیں اور صاحب سلیپنگ سوٹ پہنے چلے آ رہے ہیں تو ان کا ماتھا ٹھنکا۔ حواس باختگی سے واقف تھے۔ لپک کر پوچھا صاحب، سامان کہاں ہے؟ فرمایا "اُدھر، ٹرین میں"۔ انہوں نے عرض کیا "صاحب ٹرین تو جا چکی ہو گی کہا تو کیا ان لوگوں نے سامان نہیں اتارا ہو گا؟"

ایک روز پروفیسر مارگولیتھ کی آمد کا حال بھی سنایا۔ ایک لطیفہ مجھے اب تک یاد آتا ہے۔ میمن صاحب نے مارگولیتھ کے عربی بولنے کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ میرے کسی جملے کو سن کر مارگولیتھ نے ایک عجیب سی آواز نکالی

پھر اس کی نقل میں خود آواز نکال کر دکھائی جو سانپ کی پھنکار سے مشابہ تھی اور ناقابل فہم۔ اس آواز کو تحریر میں لانا دشوار ہے۔ پھر فرمایا کہ آپ داد دیجئے گا میں سمجھ گیا کہ یہ کہتا ہے مُستَحسَن یعنی بہت خوب۔

میں صحت یاب ہو کر واپس سرگودھا آیا تو میمن صاحب سے رابطہ منقطع ہو گیا۔ میری نالائقی کہ مراسلت کا خیال نہ آیا ورنہ انہوں نے مجھے فراموش نہ کیا تھا۔ اس کا اندازہ یوں ہوا کہ گورنمنٹ کالج سرگودھا کے ریٹائرڈ پرنسپل حافظ احمد شفیع صاحب ایک زمانے میں میمن صاحب کے شاگرد رہ چکے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ لاہور میں ایک روز بس میں اُن سے ملاقات ہو گئی تو سرگودھا کا نام سن کر اس عاجز کو بھی یاد فرمایا۔ صدر محمد ایوّب خان صاحب نے ان کو PRIDE OF PERFORMANCE کا اعزاز عطا کیا تو پاکستان ٹائمز میں ان کی تصویر دیکھی اور ایام گزشتہ کا خیال کرتا رہا۔ غالباً میمن صاحب اُس وقت تک کراچی مراجعت فرما چکے تھے۔ خدا بھلا کرے پاکستان ٹی۔ وی والوں کا آخری مرتبہ ان کی وساطت سے میمن صاحب کی چلتی پھرتی تصویر جس میں ان کے شب و روز کے معمولات کا احاطہ کیا گیا تھا دیکھی اور ان کی مانوس آواز میں ان کی کچھ آپ بیتی سنی۔ افسوس کہ یہ اس وقت سنی جب حقیقت میں وہ آواز ہمیشہ کے لئے خاموش ہو چکی تھی۔

حوالہ جات

۱۔ شاید امیر حبیب اللہ خان جن کی دلّی میں آمد کا ذکر فرحت اللہ بیگ نے نذیر احمد کی کہانی میں کیا ہے۔

۲۔ ابوالعتاھیہ کے دیوان میں اس نظم کے اکیس ۲۱ اشعار موجود ہیں۔

۳۔ یہ واقعہ بعد کو میں نے وفیات الاعیان میں بھی عماد اصفہانی کے حالات کے تحت دیکھا۔

۴۔ یہ مصرع اچھی طرح یاد نہیں آتا۔

۵۔ القرآن، ۶۹ : ۲۰

۶ - بعد کو سفرنامہ ابن البطوطہ سے معلوم ہوا کہ یہ اشعار خطیب عبدالوہاب بن علی مالقی کے ہیں اور قاضی ابو عبداللہ بن عبدالملک نے اسی زمین میں یہ شعر کہہ کر ایک قافیہ نکالا ہے۔

وَحِمُصَ لاتنسَ لهَا تِينُهَا
وَاذْكُرُ مَعَ التّيْنِ زَيَا تِينُهَا